''یہ روپے چرن داس کے پاس بھجوا دیجیے۔ باقی روپے بھی دو چار دن میں دے دوں گی۔''

دیاناتھ نے خفیف ہوکر کہا: ''روپے کہاں سے مل گئے؟''

جالپا بے باکانہ لہجے میں بولی: ''رتن کے ہاتھ اپنا کنگن بیچ دیا۔''

(24)

ایک مہینہ گزر گیا۔ الہ آباد کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار میں ایک نوٹس نکل رہا ہے، جس میں رمانا تھ کو واپس آنے کی تحریک کی گئی ہے اور اس کا سراغ لگانے والے کو پانچ سو روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ جالپا فکر اور غم سے گھلتی جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیاناتھ کو بھی اس پر رحم آنے لگا ہے۔ آخر انہوں نے ایک دن اپنے سمدھی دین دیال کو لکھا۔ آپ آ کر کچھ دنوں کے لیے بہو کر رخصت کرا لے جائیے۔ دین دیال خط پاتے ہی گھبرائے ہوئے آئے، مگر جالپا نے میکے جانے سے انکار کر دیا۔

دین دیال نے کچھ ترش ہوکر کہا: ''کیا یہاں پڑے پڑے جان دے دینے کا ارادہ کر لیا ہے؟''

جالپا نے خوددارانہ انداز سے کہا: ''اگر جان کو اس طرح جانا ہے تو کون روک سکتا ہے، لیکن میں ابھی مرنے کی نہیں۔ سچ جانیے، غم نصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی۔''

دین دیال: ''آخر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ شہزادی اور بسنتی دونوں آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ ہنسنے بولنے سے جی بہلتا رہے گا۔''

جالپا: ''یہاں اماں جی اور اماں کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب رونا ہی لکھا تو روؤں گی۔''

دین دیال: ''یہ کیا بہت ہو گئی۔ سنتے ہیں کچھ قرض ہو گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے سرکاری رقم کھا گئے تھے۔''

جالپا: ''جس نے آپ سے یہ کہا، اس نے سراسر جھوٹ کہا۔''

دین دیال: ''تو پھر چلے کیوں گئے؟''

جالپا: ''یہ میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔''

دین دیال: ''منشی دیانا تھ سے تو کھٹ پٹ نہیں ہو گئی؟''

جالپا: ''اماں جی کے سامنے تو وہ سر تک نہیں اٹھاتے تھے۔ پان تک نہیں کھاتے تھے۔ کھٹ پٹ کیا ہو گی۔ انہیں گھومنے کا شوق تھا۔ سوچا ہو گا یوں تو کوئی جانے نہ دے گا، چلو بھاگ چلیں۔''

دین دیال: ''شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو دیش بدیش پھرنے ہی کی سنک ہوتی ہے۔ تمہیں یہاں جو تکلیف ہو، صاف صاف کہہ دو۔ خرچ کے لیے کچھ بھیج دیا کروں؟''

جالپا نے تمکنت سے کہا: ''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، دادا جی آپ کی دعا سے کسی چیز کی کمی نہیں۔''

دیانا تھ ارجا گیشری نے جالپا کو سمجھایا، مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ تب دیانا تھ جھنجلا کر بولے:

''یہاں پر پڑے پڑے رونے سے تو اچھا ہے۔''

جالپا: ''کیا وہ کوئی دوسری دنیا ہے یا وہاں جا کر میں کچھ اور ہو جاؤں گی۔ جب ہنستا تھا تب ہنستی تھی، جب رونا ہے تو روؤں گی۔ رما کالے کوسوں چلے گئے ہوں، لیکن مجھے ہر دم بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کا جسم نہیں ہے، لیکن گھر کی ایک ایک چیز میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تسکین بھی نہ رہے گی۔''

دین دیال سمجھ گئے۔ یہ غرور کی پتلی اپنی ضد نہ چھوڑے گی۔ اٹھ کر باہر چلے آئے۔ شام کو چلتے وقت انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جالپا کی طرف بڑھا کر کہا:

''اسے رکھ لو، شاید کوئی ضرورت پڑے۔''

جالپا نے سر ہلا کر کہا: ''مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ دادا ہاں آپ کی دعا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے آپ کی دعا سے میری مراد بر آئے۔''

دین دیال کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ نوٹ چارپائی پر رکھ کر باہر چلے آئے۔

کنوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ ابر کے خشک ٹکڑے کبھی کبھی آسمان پر دوڑتے نظر آ جاتے تھے۔ جالپا چھت پر لیٹی ہوئی ان آسمانی وجودوں کی خوش فعلیاں دیکھا کرتی تھی، وہ طرح طرح کے رنگ بدلتے، بھانت بھانت کے روپ بھرتے، کبھی محبت سے باہم بغلگیر ہو جاتے، کبھی روٹھ کر منہ پھیر لیتے۔ ان بادلوں کے ٹکڑوں میں بھی اسے رما نا تھ ہی کی تصویر پھرتی نظر آتی۔

مصیبت میں ہماری نگاہیں خود شناسی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں۔ جالپا کو اب تک گمان ہوتا تھا کہ ایشور نے اسے اس کی خطاؤں کی سزا دی ہے۔ آخر رما نا تھ

دوسرے کا گلا دبا کر ہی تو روپے لاتے تھے۔ وہ روپے دیکھ کر کتنی خوش ہوتی تھی۔ انہیں کے لیے تو رمانا تھ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ یہ چیزیں اب اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔

آخر اس نے ایک دن ان سب چیزوں کو جمع کیا۔ مخملی سلیپر، ریشمی موزے، طرح طرح کی بیلیں، فیتے، پن، کنگھیاں، آئینہ، کوئی کہاں تک گنائے۔ اچھا خاصا ایک انبار ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو گنگا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا۔ اب سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ انہی تکلفات کے پیچھے آج اس کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ آج وہ اس طلسم کو توڑ ڈالے گی۔ ان میں کتنی ہی چیزیں تو اتنی خوبصورت تھیں کہ ان کو پھینکتے ہوئے قلق ہوتا تھا۔ آدھی رات تک وہ ان چیزوں کو اٹھا اٹھا کر رکھتی تھی۔ گویا کسی سفر کی تیاری کر رہی ہو۔ ہاں یہ فی الواقع سفر ہی تھا۔ نمائش سے حقیقت کا، باطل سے حق کا۔ دل میں سوچ رہی تھی، اب اگر ایشور کے فضل و کرم سے وہ پھر لوٹ کر گھر آئے تو وہ نہایت سادہ، بے تکلف زندگی بسر کرے گی۔ حرام کی ایک کوڑی بھی گھر نہ آنے دے گی۔

جوں ہی رات کے چار بجے سڑک پر لوگوں کے آنے جانے کی آہٹ ملنے لگی۔ جالپا نے بقچہ اٹھایا اور اشنان کرنے چلی۔ بقچہ بہت وزنی تھا۔ اسے ہاتھ میں لے کر دس قدم چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ بار بار ہاتھ بدلتی تھی۔ یہ خوف ہو رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ بوجھ لے کر چلنے کی اسے کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر جب ہاتھ شل ہو گئے تو اپنے بقچے کو پیٹھ پر رکھ لیا اور قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ لمبا گھونگھٹ نکال لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

وہ گھاٹ کے قریب پہنچی تو روشنی پھیل چکی تھی۔ یکا یک اس نے رتن کو اپنی موٹر پر آتے دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سر جھکا کر کترا کر نکل جائے، لیکن رتن نے دور ہی سے پہچان لیا اور موٹر روک کر بولی ''کہاں جا رہی ہو بہن۔ یہ پیٹھ پر بقچہ کیسا ہے؟''

رتن: ''میں تو اشنان کر کے لوٹ آئی۔ لیکن چلو تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہیں گھر پر پہنچا دوں گی۔ لاؤ یہ بقچہ رکھ دو۔''

جالپا: ''یہ کچھ بھاری نہیں ہے، تم جاؤ تمہیں دیر ہو گی۔ میں چلی جاؤں گی۔''

مگر رتن نہ مانی۔ کار سے اتر کر اس کے ہاتھ سے بقچی لے ہی لی اور گاڑی میں رکھتے ہوئے بولی:

''یہ تو بڑا بھاری ہے، کیا بھرا ہے تم نے اس میں؟ کھول کر دیکھوں؟''

جالپا: ''اس میں تمہارے دیکھنے کے لائق کوئی چیز نہیں ہے۔''

رتن نے بقچی کو کھول کر دیکھا تو حیرت میں آ کر بولی:

''ان چیزوں کو کہاں لے جاتی ہو؟''

جالپا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا:

''انہیں گنگا میں ڈبا دوں گی۔''

رتن نے اور بھی متعجب ہو کر کہا: گنگا میں؟ کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ ان چیزوں کو رکھ کر پھر لوٹ آنا۔''

جالپا نے قطعی طور پر کہا۔ ''نہیں رتن میں ان چیزوں کو ڈبو کر ہی جاؤں گی۔''

رتن: ''آخر کیوں؟''

جالپا: ''پہلے کارکو بڑھاؤ تو پھر بتاؤں۔''

رتن: ''نہیں پہلے بتادو۔''

جالپا: ''نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ پہلے کارکو بڑھاؤ۔''

جالپا نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا: ''اتنی بات تو تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اب یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ جلن ہوتی ہے۔ جب دیکھنے والا ہی نہ رہا تو انہیں رکھ کر کیا کروں گی۔''

رتن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی:

''تم بابو جی کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہو بہن! ان چیزوں کو وہ کتنی امنگوں سے لائے ہوں گے۔ تمہارے جسم پر ان کی زیبائش دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ ایک ایک چیز ان کی محبت کی یادگار ہے۔ انہیں گنگا میں ڈوبا دو گی؟''

جالپا اب فکر میں ڈوب گئی۔ دل سے پس وپیش ہونے لگا، مگر ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کرلیا۔ بولی:

''جب تک یہ چیزیں میری آنکھوں سے دور نہ ہو جائیں گی، میری طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ انہی تکلفات نے میری یہ درگت بنائی ہے۔ یہ محبت کی نشانیاں نہیں۔ میری مصیبت کی گٹھڑی ہے، محبت کا نقش تو میرے دل پر ہے۔''

رتن: ''تمہارا دل بڑا سخت ہے جالپا۔ میں تو شاید ایسا نہ کرسکتی۔''

جالپا: ''ایشور نہ کرے کہ تمہیں ایسا موقع آئے۔ سچ پوچھو تو انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، جو آدمی اپنی بیوی سے پردہ رکھتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بابو جی کی جگہ ہوتی تو یوں ناتا توڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ اپنے دل کا

سارا درد دکھ سناتی اور جو کچھ کرتی ان کے مشورے سے کرتی۔ عورت اور مرد میں پردہ کیسا؟''

رتن نے مسکرا کر کہا: ''ایسے مرد تو بہت کم ہوں گے، جو عورت سے اپنا دل کھولتے ہوں۔ جب تم خود دل میں چور رکھتی ہو تو ان سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

جالپا نے جھجکتے ہوئے کہا: ''میں نے تو اپنے دل میں کبھی چور نہیں رکھا۔''

رتن نے زور دے کر کہا: ''جھوٹ بولتی ہو۔ بالکل جھوٹ، اگر تم نے ان پر اعتبار کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور رکھتے۔''

جالپا اس الزام کو اپنے سر سے نہ ٹال سکی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پردہ داری کا آغاز پہلے اسی کی جانب سے ہوا تھا۔

گنگا کا کنارہ آ پہنچا۔ موٹر کار رک گئی۔ جالپا اتری اور بقچی کو اٹھانے لگی، مگر رتن نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا:

''نہیں میں اسے نہ لے جانے دوں گی۔ سمجھ لو ڈوب گئے۔ مجھ پر اتنا رحم کرو، بہن سمجھ کر۔''

جالپا: ''بہن کے ناتے تمہارے پیر دھو سکتی ہوں۔ مگر ان کانٹوں کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔''

رتن نے بھنویں سکوڑ کر کہا: ''کسی طرح نہ مانو گی؟''

جالپا: ''نہ۔''

رتن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔ جالپا نے بقچی اٹھائی اور تیزی سے نیچے

اتر کر اسے پانی میں پھینک دیا۔ اپنے نفس پر فتح پا کر اس کا چہرہ منور ہو گیا۔ آج اسے جتنا غرور اور جتنی مسرت ہوئی، اتنی ان چیزوں کو پا کر بھی نہ ہوئی تھی۔ ان صدہا آدمیوں میں، جو اس وقت اشنان دھیان کر رہے ہیں، شاید کسی کو بھی اپنے باطن میں نورانیت کا ایسا احساس نہ ہوا ہوگا۔ گویا صبح کو سنہری شعاعیں اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں ناچ رہی ہوں۔

جب وہ اشنان کر کے اوپر آئی تو رتن نے پوچھا: ''ڈبو دیا؟''

جالپا: ''ہاں اور کیا کرتی۔''

رتن: ''بڑی سنگدل ہو۔''

جالپا: ''یہی سنگدلی دل پر فتح پاتی ہے۔ اگر کچھ دن پہلے سنگدل ہو جاتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔''

موٹر کار چل پڑی۔

(25)

رمانا تھ کو کلکتے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی تک دیبی دین کے گھر پڑا ہوا ہے۔ اسے ہمیشہ یہی دھن سوار رہتی ہے کہ روپوؤں کا خزانہ کیسے ہاتھ آ جائے۔ طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچتا ہے، لیکن گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں جب خوب اندھیرا ہو جاتا ہے تو وہ ایک بار محلّہ کے کتب خانہ میں ضرور جاتا ہے۔ اپنے شہر اور صوبے کی خبروں کے لیے اس کی طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ اس نے وہ نوٹس دیکھا، جو دیا ناتھ نے اخباروں میں چھپوایا تھا، لیکن اسے اس پر اعتبار نہ آیا۔ کون جانے پولیس نے اسے

گرفتار کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہو۔ روپے بھلا کس نے چکائے ہوں گے، غیر ممکن۔

ایک دن اسی اخبار میں رمانا تھ کو جالپا کا ایک خط چھپا ہوا ملا۔ جالپا نے دردناک اور عاجزانہ الفاظ میں اس سے گھر لوٹ آنے کی استدعا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا، تمہارے ذمے کسی کی رقم نہیں آتی۔ تم کسی طرح کا اندیشہ مت کرو۔ میں نے پائی پائی بیباق کر دی ہے۔ رما کا دل للچایا، لیکن معاً خیال آیا یہ بھی پولیس کی شرارت ہوگی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جالپا ہی نے یہ خط لکھا۔ اگر یہ بھی سچ ہے کہ روپے گھر والوں نے ادا ہی کر دیئے ہوں گے، تو کیا اس حالت میں بھی وہ گھر جا سکتا ہے۔ سارے شہر میں اس کی بدنامی ہو رہی ہوگی۔ پولیس میں اطلاع ہو چکی ہوگی۔ اسے منہ دکھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے طے کیا، میں نہیں جس سکتا۔ جب تک کم سے کم پانچ ہزار روپے ہاتھ نہ آ جائیں، وہ گھر جانے کا نام نہ لے گا اور اب تک روپے نہیں ادا ہوئے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے تو وہ کبھی نہیں گھر جا سکتا۔

دیبی دین کے گھر میں دو کوٹھڑیاں تھیں اور سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے میں دکان تھی۔ ایک کوٹھڑی میں کھانا پکتا تھا، دوسری کوٹھڑی میں برتن بھانڈے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر ایک کوٹھڑی تھی اور چھوٹی سی کھلی ہوئی چھت۔ رما اسی بالا خانہ پر رہتا تھا۔ دیبی دین اور اس کی بڑھیا کے رہنے، بیٹھنے اور سونے کا خاص مقام نہ تھا۔ رات کو دکان بڑھ جانے کے بعد وہی برآمدہ خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ دونوں وہیں پڑے رہتے تھے۔ دیبی دین کا کام چلم پینا اور سارا دن کھیں مارنا تھا۔

دکان کا سارا کام بڑھیا کرتی تھی۔ منڈی جا کر مال سٹیشن سے بھیجنا یا لانا، یہ بار بھی اسی کے سر تھا۔ دیہی دین گاہکوں کو پہچانتا تک نہ تھا۔ بیٹھا بیٹھا رامائن، طوطا مینا، رام لیلا یا ماتا مریم کی کہانی پڑھا کرتا تھا۔ جب سے رما آ گیا ہے، بڈھے کو انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ سویرے ہی گرائمر لے کر آ بیٹھتا ہے اور نو دس بجے تک حروف پڑھتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں لطیفے بھی سناتا جاتا ہے۔ جن کا ان کے پاس بہت بڑا ذخیرہ ہے، مگر جگو بڑھیا کو رما کا آسن جمانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اسے اپنا منیم تو بنائے ہوئے ہیں۔ حساب کتاب اسی سے لکھواتی ہے، لیکن اتنے ذرا سے کام کے لیے وہ اتنا بڑا بھار نہ اٹھانا چاہتی۔ یہ کام تو وہ گاہکوں سے یونہی کرا لیا کرتی تھی۔ اس لیے رما کا رہنا اسے کھلتا تھا، لیکن رما اتنا منکسر المزاج، اتنا خلیق اور اتنا فرمانبردار ہے کہ وہ اعلانیہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہاں دوسروں پر رکھ کر اشارہ و کنایہ سے اسے سنا سنا کر دل کا بخار نکالتی رہتی تھی۔ رما نے اپنے کو برہمن کہہ رکھا ہے اور مذہبیت کا سوانگ رچائے ہوئے ہے۔ برہمن اور دھرماتما بن کر وہ ان دونوں کو مخدوم بنا سکتا ہے، بڑھیا کے مزاج سے واقف ہے، لیکن کرے کیا۔ بے حیائی کرنے پر مجبور ہے۔ حالات نے اس کی خودداری کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ایک دن رما ناتھ کتب خانہ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے رتن نظر آ پڑی۔ رتن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تلاش کر رہی ہے۔ رما کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رتن کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہاں یہ نہ جانے کہاں سے آ پہنچی۔ وہ رتن کی آنکھ بچا کر سر کو جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا اور پیچھے کے اندھیرے برآمدے میں جہاں ٹوٹے پھوٹے صندوق اور

کرسیاں پڑی تھیں، چھپا کھڑا رہا۔ رتن سے ملنے اور گھر کے حالات پوچھنے کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا، لیکن مارے شرم کے سامنے نہ آ سکتا تھا۔ اس سے پوچھنے کی کتنی ہی باتیں تھیں۔ خاص کر وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی نسبت جالپا کے کیا خیالات ہیں۔ اس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اسے مکار اور دغا باز تو نہیں سمجھتی۔ روتی تو نہیں ہے۔ دبلی تو نہیں ہو گئی ہے۔ محلّہ کے اور لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ کیا گھر کی تلاشی ہوئی ہے۔ مقدمہ چلا۔ ایسی ہی ہزاروں باتیں اس کے ذہن میں تھیں، مگر منہ کیسے دکھائے۔ وہ جھانک جھانک کر دیکھتا رہا۔ جب موٹر چلی گئی تب اس کے دل سے ایک ہفتہ تک وہ کتب خانہ نہیں گیا، گھر سے نکلا تک نہیں۔

کبھی پڑے پڑے رمانا تھ کا جی ایسا گھبراتا کہ تھانہ میں جا کر ساری روئیداد کہہ سنائے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے۔ دو چار سال کی قید اس دائمی حبس سے تو اچھی ہے۔ پھر وہ از سر نو زندگی شروع کرے گا۔ اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا، لیکن ایک ہی لمحے میں ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

اس طرح دو مہینے اور گزر گئے۔ پوس کا مہینہ آ پہنچا۔ رما کے پاس جاڑوں کا کوئی کپڑا نہ تھا۔ گھر سے تو کوئی چیز لایا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی کوئی چیز نہ بنوا سکا۔ اب تک تو اس نے دھوتی اوڑھ کر کسی طرح راتیں کاٹیں۔ مگر پوس کے کڑکڑاتے جاڑے لحاف یا کمبل کے بغیر کیسے کٹتے۔ بیچارہ رات بھر گٹھڑی بنا رہتا۔ جب بہت سردی لگتی تو بچھاون اوڑھ لیتا۔ دیبی دین نے اسے ایک پرانی دری بچھانے کو دی تھی۔ اس کے گھر میں شاید یہی سب سے اچھا بستر تھا۔ اس طبقہ کے آدمی چاہے

دس ہزار کے گہنے پہن لیں، شادی بیاہ میں دس ہزار خرچ کر دیں، لیکن بچھاون گودڑ ہی رکھیں گے۔ اس سڑی ہوئی دری سے جاڑا بھلا کیا جاتا، مگر کچھ نہ ہونے سے تو اچھا ہی تھا۔ رما مارے شرم کے دیبی دین سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور دیبی دین بھی شاید اتنا کثیر نہ برداشت کرنا چاہتا تھا یا ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ ضرورت آئی ہی نہ ہو۔ جب دن ڈھلنے لگا تو رما، رات کی تکلیف کا خیال کر کے نیم جان ہو جاتا تھا۔ گویا کالی بلا دوڑی چلی آتی ہو۔ رات کو بار بار کھڑکی کھول کر دیکھتا کہ سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے۔

ایک دن شام کو وہ کتب خانہ جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک بڑی کوٹھی کے سامنے ہزاروں کنگلے جمع ہیں۔ مجمع کے اندر گھس کر دیکھا تو معلوم ہوا کوئی سیٹھ جی کمبلوں کا دان کر رہے ہیں۔ کمبل بہت گھٹیا تھے۔ پتلے اور ہلکے مگر خلقت ایک پر ایک ٹوٹی پڑتی تھی۔ رما کے جی میں آیا ایک کمبل لے لوں۔ یہاں مجھے کون جانتا ہے۔ اگر کوئی پہچان بھی لے تو کیا ہرج ہے۔ اگر غریب برہمن خیرات کا مستحق نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے، لیکن ایک ہی لمحہ میں اس کی غیرت بیدار ہو اٹھی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا تاکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ماتھے پر تلک دیکھ کر منیم نے سمجھ لیا، یہ برہمن ہے۔ اتنے سارے کنگلوں میں خال خال ہی برہمن تھے۔ برہمنوں کو خیرات دینے کا ثواب کچھ اور ہی ہے۔ منیم دل میں خوش تھا کہ ایک برہمن دیوتا دکھائی تو دیئے، اس لیے جب اس نے رما کو جاتے دیکھا تو بولا:

''پنڈت جی کہاں چلے گئے، کمبل تو لیتے جایئے۔''

رما پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ مجھے ضرورت نہیں۔

یہ کہہ کر پھر وہ بڑھا۔ منیم نے سمجھا شاید کمبل گٹھیا دیکھ کر دیوتا جی روٹھے جا رہے ہیں۔ ایسے غیرت مند دیوتا اسے اپنی زندگی میں شاید کبھی ملے ہی نہ تھے۔ کوئی دوسرا برہمن ہوتا تو دو چار چکنی چپڑی باتیں کرتا اور کوئی اچھا سا کمبل مانگتا۔ یہ پنڈت جی بغیر کچھ کہے استغنا کی شان سے چلے جا رہے ہیں تو ضرور کوئی مہاتما ہو ں گے۔ اس نے لپک کر رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

''آیئے تو مہاراج! آپ کے لیے چوکھا کمبل رکھا ہے۔ یہ تو کنگلوں کے لیے ہے۔''

رما نے دیکھا کہ بغیر مانگے ایک چیز مل رہی ہے بلکہ زبردستی گلے لگائی جا رہی ہے، تو وہ دو چار بار نہیں نہیں، کر کے منیم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ منیم نے اسے کوٹھی میں لے جا کر تخت پر بٹھا دیا اور ایک بھاری دبیز کمبل ان کی نذر کیا۔ رما کی بے نیازی کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پانچ روپے دکھشنا کے دینا چاہے، مگر رما نے اسے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ کمبل لے کر ہی اس کا خاندانی غرور مجروح ہو چکا تھا۔ دکھشنا کے لیے ہاتھ پھیلانا اس کے لیے غیر ممکن ہو گیا۔

منیم نے حیرت سے کہا: ''آپ دکھشنا نہ لیں گے تو سیٹھ جی کو بڑا رنج ہو گا۔''

رما نے خوددارانہ انداز سے کہا۔ ''آپ کی ضد سے میں نے کمبل لے لیا، لیکن دکھشنا نہیں لے سکتا۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ جن بابو جی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں وہ مجھے بھوجن دیتے ہیں اور مجھے لے کر کیا کرنا ہے۔''

منیم: ''سیٹھ جی مانیں گے نہیں۔''

رما: ''آپ میری طرف سے کہہ دیجیے گا۔''

منیم: ''آپ کے تیاگ کا دھنیہ ہے۔ ایسے ہی برہمنوں سے دھرم کی مریادا بنی ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور بیٹھیے، سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے۔ آپ کے درشنوں سے بہت پرسن ہوں گے۔ برہمنوں کے پرم بھگت ہیں۔ ترکال سندھیا کرتے ہیں، مہاراج تین بجے رات کو گنگا تٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے آ کر پوجن پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دس بجے بھگوان کا بھوگ لگاتے ہیں۔ دوپہر کو بھوجن پاتے ہیں۔ تین چار بجے سندھیا کرنے چلے جاتے ہیں۔ آپ کا استھان کہاں ہے؟''

رما نے پریاگ نہ بتلا کر کاشی بتلایا۔ اس پر منیم جی کا اصرار اور بڑھا، لیکن رما کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں سیٹھ جی نے کوئی مذہبی بحث چھیڑ دی تو ساری قلعی کھل جائے گی۔ کسی دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے گلا چھڑایا۔

نو بجے وہ کتب خانے سے لوٹا، تو ڈر رہا تھا کہ کہیں دیبی دین نے پوچھا کہ کمبل کہاں سے ملا تو کیا جواب دوں گا۔ کوئی بہانہ ضروری تھا۔ اس نے سوچا، کہہ دوں گا ایک پہچان والے کی دکان سے ادھار لایا ہوں۔

دیبی دین نے کمبل دیکھتے ہی پوچھا ''سیٹھ کروڑی مل کے یہاں پہنچ گئے۔ کیا مہاراج؟''

رما نے پوچھا: ''کون سیٹھ کروڑی مل؟''

رما کوئی بہانہ نہ کر سکا۔ بولا ''ہاں منیم جی نے گلے لگا دیا۔ سیٹھ جی بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔''

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ ''بڑے دھرماتما ہیں۔ انہی کے تھامے تو تھمی ہے۔ نہیں اب تک مٹ گئی ہوتی۔''

رما: ''کام تو دھرماتماؤں کا کرتے ہیں۔ من کا حال ایشور جانے، جو سارے دن پوجا پاٹ میں لگا رہے، اسے دھرماتما نہیں تو اور کیا کہا جائے۔''

دیبی: ''اسے پاپی کہنا چاہیے۔ مہا پاپی۔ دیا تو کسی کے پیچھے پھٹکنے بھی نہیں پاتی۔ مظلوموں کے ساتھ جتنی کڑائی اس کے مل میں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔ آدمیوں کو ہنٹروں سے چربی ملا گھی بیچ کر اس نے لاکھوں کمائے۔ کوئی نوکر ایک منٹ کی بھی دیر کرے تو اس کی مجوری کاٹ لیتا ہے، مگر سال میں دو چار ہزار دان نہ کر دے تو پاپ کا دھن بچے کیسے۔ میں نے تو جتنے پجاری دیکھے، سب کو پتھر ہی پایا۔ پتھر پوجتے پوجتے ان کے دل بھی پتھر ہو جاتے ہیں۔ آدمی کچھ نہ کرے، من میں دیا بنائے رکھے۔ یہی سو دھرم کا ایک دھرم ہے۔''

دن کی رکھی ہوئی روٹیاں کھا کر جب رما کمبل اوڑھ کر لیٹا تو اس کا ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ رشوت میں اس نے ہزاروں روپے مارے تھے، مگر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اسے باطنی خلش نہ ہوئی تھی۔ رشوت عقل سے، عیاری سے، رعب سے ملتی ہے۔ دان نکلے، پست ہمت اور رنگے سیاروں کا سہارا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا میں اتنا ذلیل ہو گیا ہوں کہ کھانے اور کپڑے کے لیے مجھے خیرات لینا پڑتا ہے۔ وہ دیبی دین کے گھر میں دو مہینے سے پڑا تھا، مگر دیبی دین اسے محتاج نہیں، مہمان سمجھتا تھا۔ رما کے دل میں ایسا ہیجان ہوا کہ اسی وقت تھانہ میں جا کر اپنی سرگزشت کہہ سنائے۔ یہی تو ہوگا کہ دو تین سال کی سزا ہو جائے گی۔ پھر تو دل میں یہ خلش نہ ہوگی۔ کہیں ڈوب ہی کیوں نہ مروں؟ اس طرح زندہ رہنے سے فائدہ ہی کیا۔ نہ گھر کا ہوں، نہ گھاٹ کا، دوسروں کی پرورش تو کیا کروں گا، اپنے ہی لیے

دوسروں کا محتاج ہوں۔ رما نے فیصلہ کیا۔ کل وہ کام کی تلاش میں نکلے گا، جو کچھ ہونا ہے ہو۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اختتام۔۔۔۔۔حصہ اول۔۔۔۔۔۔

(26)

ابھی رما منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیبی دین پرائمر لے کر آ پہنچا اور بولا:

''بھیا! یہ تمہاری انگریزی بڑی بکٹ ہے۔ ایس۔ آئی۔ آر سر ہوتا ہے۔ تو پی۔ آئی۔ ٹی پٹ کیوں ہو جاتا ہے۔ بی۔ یو۔ ٹی بٹ ہوتا ہے تو پی یو ٹی پٹ کیوں ہوتا ہے۔ تمہیں بھی بڑی کٹھن لگتی ہو گی۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے تو کٹھن لگتی تھی مگر اب تو آسان معلوم ہوتی ہے۔''

دیبی دین: ''جس دن پرائمر ختم ہو گی، مہابیر جی کو سوا سیر لڈو چڑھاؤں گا۔ پرائمر کا مطلب ہے پرائی استری مر جائے میں کہتا ہوں۔ ہماری مرے۔ پرائی کے مرنے سے ہمیں کیا سکھ۔ تمہارے بال بچے تو ہیں بھیا۔''

رما نے اس انداز سے کہا گویا ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ''ہاں ہیں تو۔''

دیبی: ''کوئی چٹھی چپاتی آئی تھی؟''

رما: ''نہ''

دیبی: ''اور تم نے لکھی، ارے تین مہینہ سے کوئی چٹھی ہی نہیں بھیجی۔ گھبراتے نہ ہوں گے لوگ؟''

رما: ''جب تک یہاں کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے کیا خط لکھوں؟''

دیبی: ''ارے بھلے آدمی لکھ دو۔ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ گھر سے بھاگ آئے ہو۔ ان لوگوں کو کتنی چنتا ہو رہی ہو گی۔ ماں باپ تو ہیں نا؟''

رما: ''ہاں ہیں تو۔''

دیبی دین: ''تو بھیا! آج ہی چٹھی ڈال دو۔ میری بات مانو۔''

رما نے اب تک اپنی اصلیت کو چھپایا تھا۔ اسے کئی بار خواہش ہوئی کہ دیبی دین سے سارا حال کہہ دے، مگر بات ہونٹوں تک آ کر رک جاتی تھی۔ وہ دیبی دین کے منہ سے اس کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا صلاح دیتا ہے۔ اس وقت دیبی دین کی ہمدردی نے اسے مغلوب کر دیا۔ بولا:

''میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔''

دیبی دین نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا:

''میں جانتا ہوں۔ گھر والی سے ٹھن گئی ہو گی۔ وہ کہتی ہو گی میں الگ رہوں گی۔ تم کہتے ہو گے میں ماں باپ سے الگ نہ رہوں گا یا گہنوں کے لیے ضد کرتی ہو گی، کیوں؟''

رما نے شرماتے ہوئے کہا:

''کچھ ایسی ہی بات تھی، دادا۔ وہ تو گہنوں کے لیے ضد نہ کرتی تھیں، لیکن پا جاتی تھیں تو خوش ہو جاتی تھیں اور میں محبت کے نشہ میں آ گا پیچھا کچھ نہ سوچتا تھا۔''

دیبی دین کے منہ سے گویا آپ ہی آپ نکل گیا۔

''سرکاری رقم تو نہیں اڑا دی؟''

رما کا سینہ دھک سے ہو گیا۔ وہ سرکاری رقم کا معاملہ اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ دیبی دین کے اس سوال نے گویا اس کی سوئی ہوئی فوج پر چھاپہ مار دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ یکا یک کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا جواب کیا دوں؟

دیبی دین تاڑ گیا کہ اس نے کوئی دل آزار بات کہہ دی۔ زخم پر مرہم رکھتے ہوئے بولا:

''دل کی لگن بڑی بے ڈھب ہوتی ہے۔ بھیا تم تو ابھی لڑکے ہو۔ غبن کے ہجاروں مقدمے ہر سال ہوتے ہیں۔ تحقیقات کی جائے تو ایک ہی بات نکلے گی۔ گہنا۔ دس بیس وارداتیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ یہ روگ ہی ایسا ہے۔ عورت منہ سے تو یہی کہتی جاتی ہے کہ یہ کیوں لائے؟ یہ کیوں لائے؟ روپے کہاں سے آئیں گے؟ دل میں پھولی نہیں سماتی۔ یہیں ایک ڈاک بابو رہتے تھے۔ بیچارے نے چھری سے گلا کاٹ لیا۔ ایک دوسرے میاں صاحب کو جانتا ہوں، جن کو پانچ سال کی سزا ہو گئی۔ جیل میں مر گئے۔ ایک تیسرے پنڈت جی کو جانتا ہوں، جنہوں نے اپھیم کھا کر جان دے دی۔ برا روگ ہے۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ میں ہی تین سال کی سزا کاٹ چکا ہوں۔ جوانی کی بات ہے۔ جب اس بڑھیا پر جوبن تھا۔ تاکتی تھی، جو جیسے کلیجہ پر تیر چلا دیتی تھی۔ میں ڈاکیہ تھا۔ منی آرڈر تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ کانوں کے جھومک کے لیے جان کھا رہی تھی۔ کہتی تھی سونے ہی کے لوں گی۔ مجھ پر تو نشہ چھایا ہوا تھا۔ منی آرڈر بہت آتے تھے۔ ایک دن ایک منی آرڈر پر میں نے جھوٹے دستخط کر کے روپے اڑا لیے۔ کل تیس

روپے تھے، جھومک ادا کر دے دیئے۔ اتنی کھس ہوئی کہ کچھ نہ پوچھو، لیکن ایک ہی مہینہ میں چوری پکڑ لی گئی۔ تین سال کی سجا ہوگئی۔ سجا کاٹ کر نکلا تو یہاں بھاگ آیا۔ پھر کبھی گھر نہیں گیا۔ ہاں گھر چٹھی بھیج دی۔ بڑھیا کھت پاتے ہی چلی آئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر گہنوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے۔ ایک چٹھی بھیج دو لیکن نہیں پولیس تمہاری ٹوہ میں ہوگی۔ کہیں سراغ مل گیا تو کام بگڑ جائے گا۔ کہو تو میں کسی سے ایک چٹھی لکھا کر بھیج دوں۔''

رما نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں دادا غضب ہو جائے گا۔ پولیس سے زیادہ تو مجھے گھر والوں کا خوف ہے۔''

دیبی: ''ڈر پولیس کا ہے کہ گھر والوں کا۔ گھر والے تو سن کر کھس ہوں گے، پولیس والے سجا کر دیں گے۔''

رما: ''میں سزا سے بالکل نہیں ڈرتا۔ تم سے کہا نہیں۔ ایک دن مجھے کتب خانہ میں جان پہچان کی ایک عورت نظر پڑی۔ ہمارے گھر بہت آتی جاتی تھی۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری نانی مرگئی۔ ایسا سٹ پٹایا کہ اس کی طرف تاکنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ اگر اس وقت اس سے دو چار باتیں کر لیتا تو گھر کی ساری حالت معلوم ہو جاتی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرتی۔ میرے گھر میں بھی کسی سے نہ کہتی، لیکن میری ہمت نہ پڑی۔''

دیبی: ''تو پھر اسی کو کیوں نہیں ایک چٹھی لکھتے؟''

رما: ''چٹھی تو مجھ سے نہ لکھی جائے گی۔''